ڈاکٹر محمد یار گوندل
اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اردو
سرگودھا یونیورسٹی، سرگودھا

شمس الرحمٰن فاروقی۔غالب یا میر پرست

Shams-Ur-RehmanFarooqi is a well known scholar and critic.Analysis and interpretationof Meer Taqi Meer's poetry and his creative craftis his special field.He is also a serious reader and critic of Ghalib.But a contradiction appearswhen he tries to make a comparison between Meer and Ghalib.In his book Sher-i-shorAngez[4Vvolums], there are many examples when he praisesGhalibbut gives examples of Meer and tries to establish his superiority over Ghalib.This article highlights Farooqi's many contradictions in his criticism of Meer and Ghalib.The main reason of these contradictions is hisadvocacy of Meer.

کسی بھی فن کے تخلیق کار کا کسی دوسرے تخلیق کار کے ساتھ تقابل اورموازنہ سود مند ثابت نہیں ہو سکتا۔اُردو میں اس کی نمایاں مثال مولانا شبلی نعمانی کی تصنیف ''موازنہ انیس ودبیر'' ہے۔بلاشبہ شمس الرحمٰن فاروقی کی میرؔاور غالبؔ پر گرفت خاصی مضبوط ہے اوراس ضمن میں اُن کا خاصا معیاری تحقیقی اور تنقیدی کام بھی سامنے آچکا ہے۔فاروقی صاحب کی تصنیف ''شعرشورانگیز'' جلد اول پہلی بار۱۹۹۰ء میں شائع ہوئی۔اس کتاب نے اُردوادب کے ایک ادنیٰ طالب علم کی حیثیت سے راقم کی بھرپور راہنمائی کی اور مصنف کی علمی وادبی صلاحیتوں کا اعتراف بھی کھلے دل سے کیا اورآج اُس سے بڑھ کر ہے۔ راقم کی غالب سے دل لگی اور دل چسپی کا آغاز توسنِ شعور کی دہلیز پر قدم رکھتے ہی ہو گیا تھا۔اِسی دل چسپی کی بنا پر بعد میں ''غالبؔ پر سوانحی ادب'' پر ڈاکٹریٹ بھی کی۔

کچھ عرصہ پہلے لمز کا مجلّہ دراساتِ اُردو''بُنیاد'' کا شمارہ۲،۲۰۱۲ء دستیاب ہوا جس میں شمس الرحمٰن فاروقی کا مضمون بعنوان''میر کی شعری روایت''ملاحظہ کیا۔ جو ستمبر۲۰۱۰ء میں دیے ہوئے ایک لیکچر کا متن ہے جوانہوں نے بھارت کی غالب اکیڈمی میں میر پر ایک سیمینار میں دیا تھا۔دورانِ مطالعہ فوراً ذہن میں''شعر شورانگیز''جلداول کے ابتدائی مضامین''خدائے سخن،میر کہ غالب؟ '' اور''غالب کی میری'' کی بازگشت سنائی دی۔''شعرشورانگیز'' فاروقی صاحب کا میر پر انتہائی وقیع تحقیقی اورتنقیدی کام ہے۔اس کے لیے وہ دادوتحسین کے سزاوار ہیں۔اس کام میں اُن کی جگر کاوی صاف نظرآتی ہے۔اس حوالے سے انہوں نے لکھا ہے کہ میری تحریر میں نغمۂ داؤدی تو شاید نہ ہو،لیکن میر کی عظمت کو الفاظ میں منتقل کرنے کی کوشش ضرور ہے۔اس کوشش میں آپ کو دماغ کے تیل کے ساتھ ساتھ خونِ جگر کی بھی کارفرمائی شاید نظر آئے''۔[۱] بلاشبہ خونِ جگر کی آمیزش سے نقشِ میرؔ تمام ہوا ہے۔لیکن ساتھ ہی اس میں میر سے مبالغانہ حد تک عقیدت اور طرف داری کی کارفرمائی بھی نظرآتی ہے۔ حالانکہ فاروقی صاحب کو غالب سے بھی شدید لگاؤ اور دل چسپی ہے جس کا اظہار ان کی تحریروں میں بھی نظرآتا ہے۔اپنے مضمون''غبارِکارواں'' میں بی۔اے کے امتحان سے فراغت

کے بعد کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اُن دنوں سے لے کر آج تک شیکسپیر اور میرے درمیان ایک ایسا ربط قائم ہے جس کا اظہار الفاظ میں نہیں ہوسکتا اور جو غالب کے علاوہ کسی اور شاعر کے ساتھ قائم نہیں ہوسکا۔۔۔غالب کو بھی میں نے ۱۹۵۳ میں سنجیدگی سے پڑھا۔ان کے اسرار مجھ پر ذرا دیر میں کھلے لیکن بالآخر میری نظر میں غالب اور شیکسپیر کے علاوہ بہت کم رہا''[۲] اس کے علاوہ غالب پر ان کی مستقل تحریریں بھی ہیں جن میں'' تفہیم غالب''،''غالب کے چند پہلو'' اور''شعر،غیر شعر اور نثر'' میں شامل مضامین''غالب اور جدید ذہن''،''اردو شاعری پر غالب کا اثر''،''غالب کی مشکل پسندی''اور''غالب کی ایک غزل کا تجزیہ'' شامل ہیں۔

اِس مضمون میں فاروقی صاحب کے مذکورہ بالا تینوں مضامین کو مدنظر رکھ کر کچھ معروضات پیشِ خدمت ہیں۔ایک بات ذہن میں ہونی چاہیے کہ میر اور غالب کے زمانے میں خاصا فرق پایا جاتا ہے۔فاروقی صاحب کو یہ شکوہ ہے کہ جو پذیرائی آج کے دور میں غالب کے مقدر میں آرہی ہے،اس سے میر محروم کیوں ہیں۔مضمون''میر کی شعری روایت'' کی ابتدا ہی اسی حوالے سے کرتے ہیں کہ بڑی خوشی کی بات ہے کہ میر کا ذکر اب کچھ زیادہ ہونے لگا ہے۔ستمبر ۲۰۱۰ء میں میر کی وفات کو دوسو برس ہوگئے۔اس مناسبت سے کہیں کہیں میر پر جلسے اور کہیں کہیں سیمینار ہوئے۔لیکن اس ہماہمی اور گونج اور ذوق وشوق کے اظہار کا ایک شمہ بھی نظر نہ آیا جو غالب کی سوسالہ برسی پر کئی ملکوں میں دور دور تک پھیل گیا تھا۔پھر خود ہی اس کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اس کا ایک جواب تو یہ ہوسکتا ہے کہ غالب کی شاعرانہ عظمت کا مرتبہ میر سے بالاتر ہے۔یعنی میر کے مقابلے میں غالب عظیم تر شاعر ہیں،یا یہ کہ غالب ہمارے سب سے بڑے شاعر ہیں لہٰذا غالب کے تئیں ہمارے دل میں جو عزت ہے اور محبت ہے وہ میر کے لیے نہیں ہوسکتی۔مطلق طور پر یہ جواب درست ہو یا نہ ہو لیکن منطقی اعتبار سے یہ جواب اس لیے غلط ہے کہ ہم صرف اپنے لیے یا صرف اپنی طرف سے، جواب دے سکتے ہیں۔ہم تمام تاریخ کی طرف سے حکم نہیں لگا سکتے کہ غالب ہمارے سب سے بڑے شاعر ہیں۔کل کیا فیصلہ ہوگا اور کل کا تنقیدی مذاق اور کل کے قاری کا شعور کسی شاعر کے بارے میں کیا کہے گا،یہ ہم نہیں جانتے''۔[۳]

حقیقت یہ ہے کہ تاریخ کی طرف سے ہی حکم جاری ہوتا ہے۔کیوں کہ فن کے عناصر خود تاریخ کو مجبور کرتے ہیں کہ وہ کوئی حکم صادر کرے۔کالی داس،حافظ،سعدی،شیکسپیر اور گوئٹے کے بارے میں تاریخ نے ترمیم کیوں نہ کی اور اِن کے بارے میں تنقیدی مذاق اور قاری کے شعور میں آج تک تبدیلی کیوں نہ آئی۔ظاہر ہے کہ ان کا فن شعور کی بلندی اور پختگی لیے ہوئے ہے،اس لیے تاریخ نے جو فیصلہ ان کے بارے میں صادر کردیا ہے اُس میں تبدیلی ممکن نہیں۔مزید ایک نکتہ یہ بھی اٹھاتے ہیں کہ جب غالب آگئے تو میر کا درجہ غالب کے سامنے پست ہوگیا۔آب آمد،تیمّم برخاست۔لیکن یہاں مشکل یہ ہے کہ کل کلاں کوئی اور شاعر پیدا ہوسکتا ہے جو غالب کو تخت سے اتار کر ان کی جگہ لے لے''۔[۴]

ہر فن کار کی اپنی اہمیت اور جگہ ہوتی ہے،خواہ کم خواہ زیادہ۔میر کی اپنی جگہ ہے اس کو اُن سے کوئی نہیں چھین سکتا۔اسی طرح غالب کی اپنی جگہ ہے اسے کوئی دوسرا نہیں چھین سکتا۔اُردو میں ایک روشن مثال غالب اور اقبال کی ہے۔اقبال قوم کی روح میں زندہ رہنے والا gaint poet ہے۔تو کیا اس نے غالب کو اُس کے تخت سے اتار کر اُس کی جگہ لے لی؟ ہرگز نہیں غالب آج بھی اپنی جگہ قائم ودائم کھڑا ہے اور اقبال اپنی جگہ۔دونوں کا تقابل اور موازنہ سود مند ثابت نہیں ہوسکتا۔

ایک اعتراض یہ کہ ایک فیشن ایبل رائے رہی ہے کہ غالب کے اپنے زمانے میں وہ قدر نہ ہوسکی جو بعد میں ہوئی۔مصطفیٰ

خان شیفتہ پر غالب کو اتنا اعتماد تھا کہ جب تک شیفتہ کی پسندیدگی نہ حاصل کر لیتے، اپنی (فارسی) غزل دیوان میں درج نہ کرتے۔ان کا بہت مشہور شعر ہے۔

غالب بہ فن گفتگو ناز دبدیں ارزش کہ او
ننوشت در دیواں غزل تا مصطفیٰ خاں خوش نہ کرد

لیکن خود شیفتہ نے مومن کی شاگردی اختیار کی۔مومن کا انتقال ۱۸۵۲ء میں ہوااور غالب کا ۱۸۶۹ء میں،لیکن مومن کے بعد بھی شیفتہ نے غالب کی شاگردی نہ اختیار کی''۔[۵] دوسری طرف میر کے حوالے سے شیفتہ ان کے ہاں نا معتبر ٹھہرتے ہیں۔لکھتے ہیں کہ''اس قسم کی غلط فہمی پر کہ شیفتہ نے میر کے بارے میں لکھا تھا کہ''پستش بغایت پست وبلندش بسیار بلند''۔اول تو شیفتہ کون سے عرش سے ٹوٹے ہوئے تارے تھے کہ ان کی رائے بے کھٹکے تسلیم کر لی جائے۔۔۔''[۶]

اس میں شبہ کی کوئی گنجائش نہیں کہ غالب کی اپنے زمانے میں وہ قدرافزائی نہ ہوئی جس کے وہ حق دار تھے اوراس کی وجہ تھی کہ غالب کا ذہن اپنے زمانے کی رفتار سے بہت آگے تھا۔جیسا کہ ڈاکٹر وزیرآغا نے کہا ہے کہ اس میں کوئی کلام نہیں کہ غالب دراصل بیسویں صدی کا انسان تھا جوغلطی سے انیسویں صدی میں پیدا ہو گیا اور اس بات کی اسے سزا بھی ملی۔اس کی شاعری کو مہمل،اس کے اندازفکرکو نامانوس اوراس کے اسلوبِ حیات کو قابلِ اعتراض قرار دیا گیا۔[۷] دوسرے یہ کہ غالب کی شخصیت کو مدِنظر رکھتے ہوئے یہ باورنہیں کیا جاسکتا کہ وہ شیفتہ کے استحسان کے بغیر کوئی غزل اپنے دیوان میں شامل نہ کرتے۔اول یہ کہ غالب اپنے آپ کو ہندوستان کا سب سے بڑا فارسی داں سمجھتے تھے اور فارسی میں امیرخسرو کے سوا ان کی نظر میں کوئی اور جچتا نہیں تھا۔دوسرے یہ کہ شیفتہ، غالب کے مرّبی تھے اور غالب کی فطرت میں تھا کہ وہ جہاں یافت کا امکاں ہوتا وہاں اپنی توانائیاں صرف کر دیتے۔ غالب کو جب ۱۸۴۷ء میں قید کی سزا ملی تو اس دورانیہ میں شیفتہ نے اُن کا خوب خیال رکھا اور اس کے صلے میں غالب نے اُن کی مدح میں قصیدہ بھی لکھا۔اور یہ شعراسی قصیدے کا ہے۔

میر کے بارے میں کئی لوگوں کا خیال ہے کہ اُن کا کلام اب ہمارے لیے فوری اور بامعنی نہیں رہا۔سو پچاس شعرضرور میر کے یہاں ایسے ہوں گے جوہمارے ذہن کو غالب کے شعروں کی طرح متاثر کریں،لیکن عمومی طور پر میر کا نہ تو کلام ہی اس قدر اعلیٰ درجے کا ہے اور نہ اسے ہمارے ذہن سے کوئی قربت ہے۔مندرجہ بالا بیان کا یہ حصہ بالکل درست ہے کہ غالب اور جدیدذہن میں بڑی ہم آہنگی ہے،لہٰذا جدیدذہن میر کے مقابلے میں غالب کوفوقیت دیتا ہے۔اور یہی وجہ ہے کہ ہم نے غالب صدی اتنے بڑے پیمانے پر منائی۔لیکن یہ بیان ہمیں میر یا غالب کے بارے میں کسی آفاقی سچائی سے روشناس نہیں کرتا۔یہ بیان صرف ہمارا فیصلہ ہے،تاریخ کا نہیں۔ہم تاریخ کی طرف سے فیصلہ نہیں کرتے، بلکہ صرف اپنی طرف سے فیصلہ کرتے ہیں۔ممکن ہے کل کا جدیدذہن خودکو غالب سے بالکل خارج ازآہنگ پائے۔یا کل کا قاری غالب کو قبول کرنے سے انکار کردے،خواہ یہ کسی غلط فہمی ہی کی بنا پر کیوں نہ ہو''۔[۸]

حقیقت یہ ہے کہ یہ بیان صرف ہمارافیصلہ نہیں بلکہ تاریخ کا فیصلہ ہے۔اگر آج جدیدذہن اپنے آپ کو غالب سے ہم آہنگ پاتا ہے تو یقیناً مستقبل کا ذہن اس سے بھی بڑھ کر ہم آہنگ پائے گا۔دوسرے یہ ممکن ہی نہیں کہ کل کا قاری غالب کو رد کر دے۔

اس لیے کہ غالب نے اپنی شاعری میں انسانی زندگی کے سب تیور بیان کر دیے ہیں۔ممکن نہیں کہ ایک باشعور اور طبع سلیم قاری خود کو غالب سے خارج از آہنگ پائے۔فاروقی صاحب حالی پر اعتراض کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ غالب کا المیہ، بلکہ ہمارا المیہ یہ تھا کہ ہم نے غالب کے بارے میں فرض کر لیا کہ وہ ایک بالکل خالی بیابان میں تنہا شجر ہیں۔ان کے پہلے کوئی اور شجر کیا،گھاس بھی نہیں تھی۔ہم نے سائنس میں یہ بات تو قبول کر لی اور ہمیشہ کے لیے مان لی کہ گھاس نہ ہوتی تو پیڑ بھی نہ ہوتا۔لیکن ہم نے حالی کی یہ بات بھی فوراً مان لی کہ غالب کا ذاتی اور شعری مزاج یہ تھا کہ وہ شارع عام پر چلنے سے بچتے اور کتراتے تھے۔جس طرز کا شعر پہلے کہا جاچکا تھا،حالی کے بقول غالب اس طرز کا شعر ہرگز نہ کہتے تھے۔چنانچہ غالب ہماری تہذیب کا ایسا درخت ہیں جن کے پیچھے کوئی میدان نہ تھا۔وہ درخت اپنا جواز اور اپنا وجود آپ تھا''۔[۹]

غالب نے کبھی بھی شعری روایت سے انحراف نہیں کیا۔حالی کے اس بیان کا مطلب یہ ہے کہ غالب نے اپنے آپ کو محض روایت تک محدود نہیں رکھا بلکہ روایت کو برقرار رکھتے ہوئے اس میں جدت بھی پیدا کی۔گویا انہوں نے روایت کو جامد نہیں ہونے دیا بلکہ اس میں تازہ خون کی آمیزش بھی کی ہے۔اس ضمن میں دیکھیں تو خود فاروقی صاحب کو''شعرشورانگیز''میں قدم قدم پر غالب کی یاد آتی ہے۔اور یہ غالب کی جدت کی بنا پر ہے۔چند مثالیں ملاحظہ ہوں جہاں مضمون کی یکسانیت ہے لیکن اس کی ادائیگی میں بعدالمشرقین پایا جاتا ہے۔میر کا شعر۔

فرہاد ہاتھ تیشے پہ ٹک رہ کے ڈالتا
پتھر تلے کا ہاتھ ہی اپنا نکالتا

''میر کے برخلاف درد اور غالب نے اس محاورے کو صرف''مجبوری'' کے معنوں میں استعمال کیا ہے،لیکن غالب کے یہاں محاورہ،استعارہ اور پیکر اس طرح مدغم ہوگئے ہیں کہ ان کا شعر دونوں سے بڑھ گیا ہے۔

پتھر تلے کا ہاتھ ہے غفلت کے ہاتھ دل
سنگ گراں ہوا ہے یہ خواب گراں مجھے (درد)
مجبوری ودعوٰے گرفتاری الفت
دست تہ سنگ آمدہ پیمانِ وفا ہے (غالب) [۱۰]
دل تاب ہی لایا نہ ٹک تا یاد رہتا ہم نشیں
اب عیش روز وصل کا ہے جی میں بھولا خواب سا

غالب اس مضمون کو کہاں سے کہاں لے گئے ہیں۔

یاد تھیں ہم کو بھی رنگارنگ بزم آرائیاں
لیکن اب نقش ونگار طاق نسیاں ہو گئیں [۱۱]

پھر میر کی غزل نمبر۱۵ کا تیسرا شعر ؎

دی آگ رنگ گل نے واں اے صبا چمن کو
یاں ہم جلے قفس میں سن حال آشیاں کا

لکھنے کے بعد لکھتے ہیں کہ ''شعر زیر بحث کو پڑھ کر غالب کا مشہور زمانہ شعر ذہن میں آنا فطری ہے ؎

چمن میں مجھ سے روداد چمن کہتے نہ ڈر ہم دم
گری ہے جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو

غالب کے شعر میں جو نفسیاتی ژرف بینی، طنز اور ہمدردی کا امتزاج اور کنائے کی باریکی ہے، میر کے شعر میں اس کی تلاش بے سود ہو گی''۔[۱۲]

میں نودمیدہ بال چمن زاد طیر تھا
پر گھر سے اٹھ چلا سو گرفتار ہو گیا

''طیر'' اور ''پر'' کی مناسبت دل چسپ ہے۔ اسلوب اور مضمون دونوں لحاظ سے یہ غالب کے مندرجہ ذیل شعر پر اثر انداز ہوا ہے ؎

پنہاں تھا دام سخت قریب آشیاں کے
اڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے

اس حوالے سے فاروقی صاحب لکھتے ہیں کہ غالب کے شعر میں عمومی کیفیت ہے، جو اپنا رنگ آپ رکھتی ہے۔ یعنی گرفتاری کسی مخصوص بدنصیب کی تقدیر نہیں، کسی کا بھی مقدر بن سکتی ہے''۔[۱۳]

غزل نمبر۲۲ کا تیسرا شعر ؎

گرمی عشق مانع نشوونما ہوئی
میں وہ نہال تھا کہ اگا اور جل گیا

اس شعر کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ غالب نے اس مضمون کو بہت بہتر انداز میں کہا ہے ؎

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی
ہیولی برق خرمن کا ہے خون گرم دہقاں کا

غالب کا انداز پراسرار اور مفکرانہ ہے۔ دوسرے مصرعے میں ایک نازک تمثیل بیان ہوئی ہے۔ میر کا شعر ان صفات سے خالی ہے''۔[۱۴]

غزل نمبر۳۴ کا چوتھا شعر ؎

بتاں کے عشق نے بے اختیار کر ڈالا
وہ دل کہ جس کا خدائی میں اختیار رہا

کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ اس مضمون کو غالب نے اپنے مخصوص رنگ میں یوں ادا کیا ہے ؎

وہ نالہ دل میں خس کے برابر جگہ نہ پائے
جس نالے سے شگاف پڑے آفتاب میں

حق یہ ہے کہ غالب کے شعر کی سج دھج کے مقابلے میں میر کا شعر پھیکا ہے''۔[۱۵]

روایت کے تسلسل پر بات کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ناقدین نے غالب کو اردو شاعری کی روایت سے الگ کر کے غلط کیا ہے اور یہ بات غالب کی شان میں بڑے فخر سے کہی گئی کہ ان کا کوئی استاد نہ تھا۔اسی حوالے سے آگے چل کر لکھتے ہیں کہ اب یہ ہمارا فرض تھا کہ میر سے ناسخ اور پھر غالب تک کسی قسم کا تسلسل دریافت کرتے۔لیکن ۱۸۵۷ء کے بعد ہمارے یہاں سیاسی انقطاع اس قدر زبردست اور اس قدر موثر طور پر واقع ہوا کہ میر کے بعد جو کچھ ہوا ہم نے اسے بھلا کر غالب پر تنہا تکیہ کیا''۔[۱۶]

اصل میں غالب کے حوالے سے حقیقت ہی یہی ہے کہ اب معاشرے کا رنگ ڈھنگ ہی کچھ اور تھا اور غالب وہ پہلا شخص تھا جس نے نہ صرف آنے والے دور کو بہت پہلے بھانپ لیا تھا بلکہ اس نئے زمانے کے لیے ایسا فن بھی تخلیق کیا جو زمانے کی نبض پر ہاتھ بھی رکھتا تھا۔یہی وجہ ہے کہ غالب کو ۱۸۵۷ء سے پہلے وہ پذیرائی نہ مل سکی جو بعد میں ملی اور یہی وہ سبب ہے جس کی بنا پر ایک طرف میر کی شاعری اتنی قابل اعتنا نہ رہی جتنی پہلے تھی۔کیوں کہ زمانے کا مذاق اور مزاج بدل چکا تھا اور غالب کی شاعری اس مذاق اور مزاج کی عکاسی کر رہی تھی جس کو معاشرے کو ضرورت تھی۔فاروقی صاحب لکھتے ہیں کہ میر نے شعر کی ایک اور خصوصیت کا ذکر کیا ہے جسے ''کیفیت'' کہتے ہیں

نہ ہو کیوں ریختہ بے شورش و کیفیت و معنی

اور ان کے نزدیک کیفیت کا مطلب یہ ہے کہ جب کسی شعر میں بظاہر کوئی معنوی پیچیدگی یا گہرائی نہ ہو اور پھر بھی وہ فوراً سامع کے اوپر جذباتی ردعمل پیدا کرے۔وہ لکھتے ہیں کہ ''غالب نے ''کیفیت'' کا ذکر کہیں نہیں کیا ہے۔اس اصطلاح کے بھی معنی اب گم ہو گئے ہیں،لیکن درحقیقت کیفیت اس چیز کا نام ہے جس کو ذہن میں رکھ کر بیدل نے اپنا مشہور فقرہ کہا ہو گا کہ ''شعر خوب معنی نہ دارد''۔۔۔بعض اوقات ایسے شعر کے معنی الفاظ میں بیان بھی نہیں ہو سکتے۔لیکن اگر اس کا جذباتی تاثر یا محاکاتی اثر دیرپا نہ ہو،یا بعض مخصوص سیاق وسباق کا محتاج ہو،تو اس شعر میں کیفیت نہیں،بلکہ سطحیت ہوگی۔میر نے اس نظریے کو اس طرح بھی بیان کیا ہے ؎

کس نے سن شعر میر یہ نہ کہا
کہیو پھر ہائے کیا کہا صاحب

''کہیو پھر'' میں شعر کو صرف دہرانے کی درخواست نہیں ہے،بلکہ نکتہ یہ بھی ہے کہ ایسا شعر اور بھی کہو۔غالب کے یہاں کیفیت کے شعر خال خال ہیں،لیکن میر کے یہاں ایسے شعر کثرت سے ہیں۔۔۔حقیقت یہ ہے کہ کیفیت کے علاوہ شعر میر کی تمام تر خصوصیات غالب کے یہاں غالب کی اپنی تخلیقی شان کے ساتھ وارد ہوئی ہیں۔ان کی شعریات کے کئی پہلوؤں میں مماثلت ان کے ذہنی اشتراک پر دال ہے''۔[۱۷]

میر کے مذکورہ شعر میں شاعرانہ تعلّی واضح نظر آرہی ہے۔اس کے علاوہ اس میں وہی کیفیت پائی جاتی ہے جس کو بیدل نے''شعر خوب معنی نہ دارد'' کہا ہے اور میر کے یہاں ایسے شعر کثرت سے ہیں۔ترقی یافتہ شعری ذوق اور تنقیدی شعور یہ سوال کرے گا کہ یہ کس قسم کی کیفیت ہے اور کس درجے کی ہے۔

جیسا کہ حسن عسکری نے کہا ہے کہ''جس ادب کی تخلیق میں دماغ استعمال نہ ہو، برساتی کھمبیوں کی طرح ہے جس سے زمین تو ڈھک جاتی ہے مگر غذا حاصل نہیں ہوسکتی''۔[۱۸] یہ درست ہے کہ غالب تاریخ میں رہتے ہوئے بھی اس کی تابع داری نہیں کرتے اور بقول ڈاکٹر آفتاب احمد خاں''غالب ہم سے ایک ہم عصر کی طرح مکالمہ کرتے ہیں''[۱۹] جب کہ میر اس صفت سے محروم نظر آتے ہیں۔میر اور غالب کے فرق کا ذکر کرتے ہوئے حسن عسکری لکھتے ہیں''میرؔ عام زندگی کو اپنے اندر جذب کرنا چاہتے ہیں، غالبؔ اسے اپنے اندر سے خارج کرنا چاہتے ہیں۔یعنی غالب روحانی بلندی کا صرف ایک ہی تصور کر سکتے ہیں کہ تعینات کو نیچے چھوڑ کر اوپر اٹھیں۔میرؔ انہی تعینات میں رہ کر اور ان تعینات کی تہہ میں جا کر وہ روحانی درجہ حاصل کرنا چاہتے ہیں''[۲۰]

روایت کے بارے میں لکھتے ہیں کہ''بعد میں جب روایت کے بارے میں کچھ بات ہونی لگی تو کہا گیا کہ روایت کے''صالح''عناصر کو اختیار یا قبول کر سکتے ہیں۔گویا روایت کوئی مردہ جسم ہے جس میں سے وہ اعضا جو صحت مند ہیں انھیں نکال کر دوسرے اپنے کام میں لا سکتے ہیں،لیکن جو اعضا کہ فاسد ہیں،انھیں سختی سے مسترد کر دینا چاہیے''۔[۲۱]

یہاں جو روایت کا تصور پیش کیا گیا ہے وہ ایک جامد تصور ہے۔اس تصور پر عمل پیرا ہونے سے روایت کے اپنی موت آپ مرنے کے وسیع امکانات ہیں۔اس سے ادب میں بھی کہنگی اور فرسودگی پیدا ہو جاتی ہے اور اس میں جدت اور تازگی کا عنصر مفقود ہو جاتا ہے۔یہ ضروری بھی نہیں کہ ہر قسم کی روایت کو گلے لگایا جائے اور تخلیق کار جو کہ اولیں نقاد بھی ہوتا ہے ،اس امر کو مدنظر رکھتا ہے کہ اسے کہاں کہاں تک روایت پر عمل پیرا ہونا ہے اور کہاں کہاں اس سے الگ رہ کر تخلیقی سفر جاری رکھنا ہے۔دوسرے یہ کہ انفرادیت کی پاس داری کو اس طرح قائم نہیں رکھا جا سکتا۔ادبی انفرادیت بھی حقیقت میں کچھ عرصہ بعد روایت ہی کا روپ دھار لیتی ہے لیکن محض روایت کی پابندی تو تخلیق کار کو پابند سلاسل کر دیتی ہے اور اس کے اوریجنل کام کو بھی سامنے نہیں آنے دیتی۔ادب عالیہ پر نظر ڈالیں تو معلوم ہو گا کہ آفاقیت انہی کے مقدر میں آئی جنہوں نے خود اپنا راستہ نکالا اور جنہوں نے دوسروں کے چبائے ہوئے نوالے چبانے پر اکتفا کی وہ خود بھی راہ میں گم ہو گئے۔یہی چیز غالب کو بھی زندہ اور تروتازہ رکھے ہوئے ہے۔اس کا اندازہ خود فاروقی صاحب کو بھی ہے جس کا اظہار انہوں نے اپنے مضمون''غالب اور جدید ذہن''میں کیا ہے۔لکھتے ہیں کہ:

''ترقی پسند نظریہ اور حالی میں یہ بات مشترک تھی کہ دونوں روایتی شاعری سے نالاں تھے اور انسان کو شاعری میں اس کا اصل مقام دلانے پر مصر۔یہاں بھی غالب ان کے کام آئے کیوں کہ غالب کا تفکر اور حقائق تک پہنچنے کا میلان روایتی شاعری کی نفی کرتا تھا اور ان کا خوددار،خودبیں،باوقار انسان وہ پس ماندہ اور قدموں تلے کچلا ہوا شخص نہیں تھا جس کی تصویر ترقی پسند نقادوں کو عام اردو شاعری میں دکھائی دیتی تھی۔ترقی پسند نقادوں کو غالب میں احتجاج اور بغاوت کے عناصر نظر آئے''۔[۲۲]

غزل کی روایت پر بات کرتے ہوئے اختر انصاری لکھتے ہیں کہ''اُردو کی روایتی غزل اپنے تمام کلاسیکی آن بان کے ساتھ غالب کی شاعری کے روپ میں اپنے انتہائی نقطۂ عروج کو پہنچ گئی اور اس کے بعد روایتی خطوط پر اُس کے مزید ارتقا کا کوئی امکان

باقی نہیں رہا۔غالب کی غزل نے حدِسکندری بن کرآگے بڑھنے کے تمام راستوں کومسدودکردیا۔اس بات کویوں بھی کہا جا سکتا ہے-اورغالبؔ کی نابغیت اورعبقریت کوشاید اس سے بڑھ کرخراجِ تحسین پیش کیا بھی نہیں جا سکتا-کہ اس نے اردو کی کلاسیکی غزل کا خاتمہ کردیا۔یعنی کم وبیش دوسوسال تک جن خطوط پر اردوغزل کا ارتقا ہوا تھاانھیں خطوط پرقائم رہتے ہوئے اور انھیں بنیادوں پراپنے فکروفن کی عمارت کواستوار کرتے ہوئے غالب نے بلندی کے اس نقطے کوچھولیا جس سے بلندتر مقام کا تصور بظاہراورعملاً ناممکن ہو گیا۔[۲۳] حالانکہ خود ہی غالب کے بارے میں یہ بھی لکھتے ہیں کہ ندرت طلب طبیعت اپنی عمارت انھی چیزوں پراستوار کرتی ہے جو پہلے سے موجود ہوں،لیکن اس کی عمارت اپنی تفصیلات وجزئیات میں پہلے سے موجود بنیادوں سے مختلف بنتی ہے۔غالب کا یہی عالم تھا''۔[۲۴]

روایت کا ذکر کرتے ہوئے فاروقی صاحب لکھتے ہیں کہ''چلئے اردو کی روایت سے ولی بھی خارج ہوئے کیوں کہ میرانھیں کچھ نہ سمجھتے تھے''۔[۲۵] میر کا اثر کیوں اورکس طرح پھیلا،اورمیر کے لائے ہوئے انقلاب کی نوعیت کیا تھی،اسے سمجھنے کے لیے ہمیں ولی کے بارے میں جاننا چاہیے۔ولی نہ ہوتے تو میر کا ہونا اگر ناممکن نہیں تو بہت مشکل ضرور تھا۔میں اسے سرے سے ناممکن نہیں کہتا کیوں کہ میر نے خود ہی ریختہ،یعنی اردو کی شاعری کے بارے میں صاف صاف کہہ دیا تھا کہ یہ فارسی والوں کی طرز میں شاہجہاں آباد کی زبان میں ہے۔مگر یہ بات تو یقینی ہے کہ میر کے انقلاب کے لیے ولی نے راہ ہموار کی تھی۔ولی اور میر میں وہی رشتہ ہے جو ناسخ اورغالب میں ہے''[۲۶] مذکورہ اقتباس میں کچھ جملے معترضہ بھی ہیں۔مثلاً میر ولی کو کچھ نہ سمجھتے تھے تو پھر غالب کے بارے میں اتنا پریشاں کیوں ہیں۔دوسرے ولی نہ ہوتے تو میر کا ہونا مشکل ضرور تھا لیکن ناممکن ہرگز نہ تھا۔مزید آگے چل کر یہ بھی لکھا ہے کہ''ولی کے بہت سے اشعارایسے ہیں جن پر میر کا گمان گزرسکتا ہے۔ظاہر ہے کہ ولی کاانداز میر کے یہاں بہت ترقی کر کے آیا ہے۔اور یہ بھی ظاہر ہے کہ ولی بہت بڑے شاعر تھے،لیکن میر سے بڑے شاعر نہ تھے''[۲۷]

شاید بقول فاروقی صاحب،پروفیسرمحمدحسن صاحب نے درست ہی کہا تھا کہ جوشخص میراورغالب کی شعریات کوایک ہی مانے،اسے میر کے بارے میں کچھ معلوم ہے نہ غالب کے بارے میں[۲۸] اور پھر خود ہی لکھا ہے کہ''غالب نے میر کی زبان اوراسلوب کوکبھی اختیار نہ کیا۔جس طرح کی''اشرافیہ''اور''ادبی''زبان کے وہ خالق تھے،وہ میر کی سی زبان کوقبول ہی نہ کرسکتی تھی''[۲۹] ایک جگہ پھراس حوالے سے لکھتے ہیں کہ غالب اورمیر کا موازنہ کرنا،یاان کا بیک وقت مطالعہ اس غرض سے کرنا کہ ایک کے ذریعے دوسرے پر روشنی پڑے،غلط کارگزاری نہیں،بلکہ دراصل دونوں کی تعیّن قدر کی پہلی منزل ہے۔یہ اکثر کہا گیا ہے کہ غالب اور میر الگ الگ طرح کے شاعر ہیں۔میں نے اس بات سے ہمیشہ انکار کیا ہے۔دونوں کے اسلوب مختلف ضرور ہیں،لیکن دونوں ایک ہی طرح کے شاعر ہیں،اس معنی میں کہ دونوں کی شعریات ایک ہیں''[۳۰] لیکن اسی اصول کی نفی وہ اپنے مضمون''اردو شاعری پرغالب کا اثر''میں کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''بڑا شاعراپنا کوئی اسکول قائم نہیں کرتا،یہ بات عجیب ضرور ہے لیکن اتنی عجیب نہیں جتنی یہ حقیقت کہ بڑے شاعر کی آنکھ بند ہوتے ہی جوشعری اسلوب نمودار ہوتا ہے وہ اس کے اسلوب کی تقریباً ضد ہوتا ہے،اوراگرضدنہیں ہوتا تواس سے قطعاً مختلف ضرور ہوتا ہے۔یہ بات کوئی صرف اردو پرصادق نہیں آتی۔یونان کے تینوں بڑے ڈرامہ نگار ایک دوسرے سے نہ صرف مختلف ہیں،بلکہ

اکثر متغائر بھی ہیں''۔(۳۱)

ایک بات تو یہ کہ شعریات کی اصطلاح ہی مبہم ہے اور بادی النظر شعریات اور روایت ہم معنی ہیں۔گویا ایک زبان اور ایک معاشرے میں رہنے والے شعرا کی شعریات تو ایک ہی ہوتی ہیں۔اگر اس مفروضے کو تسلیم کر لیا جائے تو ایک شاعر کو دوسرے شاعر سے کس طرح ممتاز کیا جا سکتا ہے۔کیوں کہ ادب میں کوئی سائنسی فارمولہ تو استعمال کیا نہیں جا سکتا۔اس موضوع پر بات کرتے ہوئے جاوید رحمانی لکھتے ہیں کہ''وہ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ''غالبؔ اور میرؔ کی شعریات ایک طرح کی ہے''یہ دلیل طلب ہے یا پھر شعریات سے فاروقی کی مراد کیا ہے؟اس کی وضاحت ضروری تھی۔خصوصاً اس لیے بھی کہ اس کے فوراً بعد فاروقی لکھتے ہیں:

''غالب کا تخیل آسمانی اور باریک تھا،میر کا تخیل زمینی اور بے لگام۔غالبؔ نے اپنی شاعری کے لیے اس طرح کی زبان وضع کی جسے ادبی زبان کہا جاسکتا ہے۔میرؔ نے روزمرہ کی زبان کو شاعری کی زبان بنایا''۔

یہاں پر یہ سوال پوچھا جاسکتا ہے کہ جب تخیل مختلف،دائرہ کار مختلف اور زبان مختلف تو شعریات ایک طرح کی کیسے ہوئی؟کیا صرف اس لیے کہ دونوں کا ذریعۂ اظہار اردو ہے؟یہ شعریات کے مفہوم کو ضرورت سے زیادہ وسعت دے دینا ہوگا''۔[۳۲]

اسی حوالے سے اپنے مضمون''غالب کی میری'' میں لکھتے ہیں کہ غالب نے میر سے بار بار استفادہ کیا ہے۔یہ اس بات کی دلیل ہے کہ غالب اور میر ایک ہی طرح کے شاعر تھے،یعنی بعض مظاہر کائنات اور زندگی کے بعض تجربات کو شعر میں ظاہر کرنے کے لیے دونوں ایک ہی طرح کے وسائل استعمال کرنا پسند کرتے تھے۔اس کا مطلب یہ نہیں کہ غالب کا اسلوب میر سے مستعار ہے،اس کا مطلب یہ بھی نہیں کہ زندگی کے کسی موقعے یا منزل پر غالب نے طرز میر کو اختیار کرنے کی کوشش کی۔اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ دونوں شاعروں کی ذہنی ساخت اور طرز فکر میں مماثلت تھی''[۳۳] اب اس اقتباس کا آخری جملہ خاصا قابل غور ہے۔میر اور غالب کی ذہنی ساخت اور طرز فکر میں کوئی مماثلت نہیں ہے اور نہ ہوسکتی ہے۔وجہ اس کی یہ ہے کہ دونوں کا تخلیقی دور ایک نہیں ہے۔دوسرے یہ کہ غالب کا طرز فکر میر جیسا نہیں ہے۔غالب کے ہاں جذبہ تفکر کے زیر سایہ سفر کرتا ہے۔جیسا کہ سلیم احمد نے کہا ہے کہ جذبے کو عقل اور منطق کے مراحل سے گزارنے کا میلان غالب کے یہاں اتنا شدید ہے کہ وہ روحانی اور مابعد الطبیعاتی تجربوں کی دلیل بھی مادی اور معروضی تجربوں میں ڈھونڈ نکالتے ہیں''[۳۴] اس حوالے سے خود فاروقی صاحب نے اپنے مضمون''غالب اور جدید ذہن''میں لکھا ہے کہ اُردو شاعری میں دماغ کی کارفرمائی کا عمل،جس کی انتہا،اور اکثر روکھی پھیکی انتہا،اقبال کے یہاں ملتی ہے،غالب نے شروع کیا تھا''۔[۳۵] اس کی مثالیں خود فاروقی صاحب نے شعر شور انگیز میں بھی دی ہیں مثلاً ایک جگہ لکھتے ہیں کہ اگر غالب پر بیدل کا اثر نہ ہوتا تو ہم کہہ سکتے تھے کہ میر کے تجریدی اشعار سے بھی غالب نے استفادہ کیا ہوگا۔لیکن چونکہ عام طور پر میر کا تخیل ٹھوس اور مرئی اشیا سے کھیلتا ہے،اس لیے ان کی فارسیت غالب سے مختلف طرح کی ہے۔یہ بات ملحوظ رہے کہ اردو کے بیش تر تصوراتی اور تجریدی الفاظ فارسی الاصل ہیں،اس لیے غالب کی فارسیت ان کی تجریدیت کے لیے سونے پر سہاگہ بن گئی''[۳۶] شعر شور انگیز کی غزل نمبر۲۲ کا تیسرا شعر۔

گرمی عشق مانع نشوونما ہوئی
میں وہ نہال تھا کہ اگا اور جل گیا

پر بات کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ غالب نے اس مضمون کو بہت بہتر انداز میں کہا ہے ؎

مری تعمیر میں مضمر ہے اک صورت خرابی کی
ہیولٰی برق خرمن کا ہے خون گرم دہقاں کا

غالب کا انداز پراسرار اور مفکرانہ ہے۔دوسرے مصرعے میں ایک نازک تمثیل بیان ہوئی ہے۔میر کا شعر ان صفات سے خالی ہے۔''[۳۷]

لکھتے ہیں کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ بعض معاملات میں غالب کا مرتبہ میر سے بلند تر ہے،لیکن اس کے باوجود غالب کو میں خدائے سخن نہیں کہتا،بعض حالات میں میر کو خدائے سخن کہہ سکتا ہوں۔[۳۸] اس جملے میں واضح تناقص اور تضاد پایا جاتا ہے۔ یہاں تذبذب اور جانب داری کا عنصر واضح نظر آ رہا ہے بلکہ اس جملے کو پڑھ کر فوراً غالب کا شعر یاد آ جاتا ہے ؎

ایماں مجھے روکے ہے جو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ میرے پیچھے ہے کلیسا میرے آگے

لکھتے ہیں کہ غالب کا وہ شعر جس میں انہوں نے میر کے دیوان کو''کم از گلشنِ کشمیر نہیں'' کہا تھا،ان کے زمانہ نوجوانی کا ہے۔اور وہ شعر جو گلشنِ کشمیر والے شعر سے زیادہ مشہور ہے،وسط عمر کا ہے،کیوں کہ یہ غزل ۱۸۴۷ اور ۱۸۵۰ کے درمیان کی ہے۔اس کی تحریر کے وقت غالب کی عمر پچاس سے کچھ کم یا زیادہ تھی۔میری مراد اس مقطع سے ہے ؎

ریختے کے تمھیں استاد نہیں ہو غالب
کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا

ان حقائق کے ساتھ ساتھ ہم اگر اس بات کا بھی خیال رکھیں کہ غالب نے میر سے دل کھول کر استفادہ کیا ہے،اور جن غزلوں نے غالب کو غالب بنایا،ان میں سے اکثر ایسی ہیں جو غالب نے تیس برس کی عمر کو پہنچنے سے پہلے لکھی تھیں،اور غالب کا میر سے استفادہ تقلیدی نہیں بلکہ تخلیقی ہے،تو یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ غالب کے تخلیقی سرچشمے میں جو دھارے آ کر ملتے ہیں ان میں بیدل اور سبک ہندی کے بعض دوسرے''بدنام''شعرا کے علاوہ میر کا دریائے ذخار بھی ہے۔[۳۹]

غالب کے ان اشعار کو بنیاد بنا کر جن میں میر کی تعریف اور بڑائی کا پہلو نکلتا ہے یہ سمجھ لینا کہ غالب میر کی برتری،اپنی عاجزی اور تقلیدِ میر کا اظہار کر رہے ہیں،درست نہیں ہوگا۔اشعار ملاحظہ ہوں ؎

ریختے کے تمھیں استاد نہیں ہو غالبؔ
کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میرؔ بھی تھا
غالبؔ اپنا یہ عقیدہ ہے بہ قول ناسخ
آپ بے بہرہ ہے جو معتقد میرؔ نہیں

پہلے شعر میں غالب نے شاعرانہ تعلّی سے کام لیا ہے اور جس چیز کو وہ نمایاں کرنا چاہتے ہیں وہ ان کی اردو شاعری کا کمال ہے اور اپنے شدید تفاخر کو کم کرنے کے لیے میر کو سہارا بنایا ہے۔دوسرے مصرے میں'' کہتے ہیں'' قابل غور ہے۔یعنی میں خود نہیں کہتا بلکہ دوسرے لوگ کہتے ہیں کہ ماضی میں کوئی میر بھی ریختے کا استاد تھا۔دوسرے شعر میں بھی''معتقدِ میر''اپنی طرف سے نہیں بلکہ ناسخ کی طرف سے کہلوایا گیا ہے۔ہاں غالب کا ایک شعر واقعی ایسا ہے جس میں میر کو خراجِ تحسین پیش کیا گیا ہے ۔

میؔر کے شعر کا احوال کہوں کیا غالبؔ
جس کا دیوان کم از گلشنِ کشمیر نہیں

غالب کو خود بھی اپنے ریختہ پر ناز تھا جس کا اظہار اس شعر میں نظر آتا ہے ۔

جو یہ کہے کہ ریختہ کیوں کہ ہو رشکِ فارسی
گفتۂ غالب ایک بار پڑھ کے اسے سنا کہ یوں

عظیم شاعر اپنے سے پیشتر بڑے شاعر کو خراج تحسین پیش کرتا ہے جیسے کہ اقبال نے غالب کو اور فیض اور مجید امجد نے اقبال کو خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔

ایک طویل پیرائے میں غالب سے میر کی مماثلتوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ میر کی دنیا روزمرہ کے واقعات سے بھری ہوئی ہے،اوران واقعات کو وہ ایک جذباتی معنویت بخش دیتے ہیں۔ان کے یہاں کرداروں کی کثرت ہے۔غالب کی دنیا اگرچہ میر ہی کے اتنی بھرپور ہے لیکن اس میں واقعات اور کرداروں کی یہ کثرت نہیں،اس لیے دونوں کا تاثر مختلف معلوم ہوتا ہے''[۴۰]

درحقیقت غالب کا یہ شیوہ ہی نہیں ۔وہ تو کثرت میں وحدت اور انتشار میں شیرازہ بندی کا ہنر دکھانے کا ماہر ہے۔اسی لیے تو کہتا ہے کہ ۔

گنجینہ معنی کا اس کو طلسم سمجھیے
جو لفظ کہ غالبؔ میرے اشعار میں آوے
قطرہ میں دجلہ دکھائی نہ دے
کھیل لڑکوں کا ہوا دیدہ بینا نہ ہوا

عام زبان اور شاعری کی زبان میں روزمرہ کے استعمال کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ غالب کے یہاں روزمرہ سے دوری کا ذکر مجھے میر کی اس خصوصیت کی طرف لاتا ہے جسے میں ان کے عظیم ترین کارناموں میں شمار کرتا ہوں۔یعنی یہ کہ میر نے روزمرہ کی زبان کو شاعر کی زبان بنا دیا۔یہ کام ان کے علاوہ کسی سے نہ ہوا۔۔لیکن روزمرہ کی تعریف قائم کرنا ضروری ہے،ورنہ غالب کی زبان کو بھی روزمرہ کا درجہ کیوں نہ دیا جائے؟ آڈن(Auden)نے لکھا ہے کہ عام زبان تو محض اس کام آسکتی ہے کہ اس میں زندگی کے عام سوال جواب ہوسکیں۔مثلاً یہ کہ''اس وقت کیا بجا ہے؟''یا''اسٹیشن کا راستہ کون سا ہے؟''۔۔آڈن کے خیالات بڑی حد تک والیری(Valery)سے ماخوذ ہیں۔والیری کہتا ہے کہ وہ زبان جو عام ضروریات کے لیے استعمال ہوتی ہے،وہ اپنا مقصد

پورا کر کے ختم ہوجاتی ہے۔یعنی وہ بیان جس میں کسی عام،عملی ضرورت یاخیال کااظہار کیا گیاہو،اپنا مافی الضمیر اپنے مخاطب تک پہنچانے کے بعد بے کارہوجاتا ہے۔۔۔یعنی وہ بیانات جوعملی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے کہے یا لکھے جاتے ہیں،اپنا مقصد پورا کرنے کے بعد غیرضروری اور بےمعنی ہو جاتے ہیں۔ظاہر ہے کہ عملی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے جو بیانات کہے یا لکھے جاتے ہیں،ان کی صورت روزمرہ کی ہوتی ہوگی۔یاان کی حیثیت روزمرہ کی ہوتی ہوگی۔والیری کا کہنا ہے کہ یہ زبان شاعری کے کام نہیں آسکتی۔شاعری کی حیثیت زبان بنانی پڑتی ہے۔عام زبان،جسے والیری''پبلک کی زبان'' کہتا ہے،روایتی اورغیرعقلی ہیئتوں اورقاعدوں کا مجموعہ ہوتی ہے،ایسا مجموعہ جو بے ڈھنگے پن اور بے قاعدگی کا خلق کردہ،ملاوٹ سے بھرپوراور''لفظیات کے صوتی اورمعنیاتی ردوبدل'' کا آئینہ دار ہوتا ہے۔

والیری اسی بنا پرشاعری اور زبان اورنثر میں فرق کرتا ہے۔وہ اس بات پراصرار کرتا ہے کہ شاعری میں بھی افکاروتصورات بیان ہوتے ہیں۔''افکار'' کی تعریف وہ یوں کرتا ہے:''فکروہ کارگذاری ہے جوچیزوں کو ہمارے اندرزندہ کردیتی ہے،جووجودنہیں رکھتیں۔۔۔اورہمیں اس بات پرقادرکرتی ہے کہ ہم جزو میں کل،صورت کومعنی سمجھ لیں،جوہم میں التباس پیدا کرتی ہے کہ ہم اپنے بے چارے پیارے جسم سے الگ ہوکربھی دیکھ سکتے ہیں،افعال کوعمل میں لاسکتے ہیں،دکھ اٹھا سکتے ہیں۔۔۔''والیری کہتا ہے کہ یہ خیال غلط ہے کہ شاعری کے تفکر کی گہرائی سائنس داں یافلسفی کے تفکر کی گہرائی سے مختلف ہوتی ہے کہ شاعر کے شاعرانہ عمل میں تفکراورتجریدفکرموجود ہوتی ہے،شعر سے باہراسے تلاش کرنا فضول ہے۔تھوڑاسا غوربھی اس بات کوواضح کردے گا کہ والیری جس قسم کے شاعر کا ذکر کررہا ہے،وہ غالب کی طرح کاشاعرہے۔یعنی ایسا شاعر جوایسی زبان سے گریز کرتا ہے جوعام ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے استعمال کی جاتی ہے''۔[۴۱]

اس اقتباس کے ملاحظہ کرنے سے عیاں ہوتا ہے کہ فاروقی صاحب خود ہی غالب کی عظمت کا اعتراف کررہے ہیں۔اس میں کوئی شبہ نہیں کہ غالب نے اپنے آپ کو بازاری،سوقیانہ،روزمرہ اور محاورات سے مملو زبان سے بچایا ہے۔اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ اس کو اس بات کا بخوبی علم تھا کہ روزمرہ اورمحاورات علاقائی خصوصیات رکھتے ہیں اور ان کے استعمال کی اہمیت صرف ایک محدود علاقے تک ہی ہوتی ہے۔ایسی زبان کا حامل فن جغرافیائی حدود کوتوڑنے سے محروم ہوتا ہے۔دوسرے یہ کہ غالب نہ صرف شعروں کے انتخاب کے واسطے رسوا ہوا ہے بلکہ الفاظ کے انتخاب میں بھی اسے پاپڑ بیلنے پڑے ہیں۔ دراصل غالب الفاظ میں پوشیدہ توانائی کا راز پا گیا ہوا تھا۔اس کے ساتھ ساتھ الفاظ کے مناسب استعمال پر اسے قدرت بھی حاصل تھی۔ظاہر ہے جن الفاظ میں توانائی زیادہ ہوگی ان میں ادائیگی مفہوم کی شدت بھی زیادہ ہوگی۔فاروقی صاحب خود ہی روزمرہ کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ وہ زبان جوتصورات(concepts)اورنازک یاباریک جذبات(subtle emotions)کوادا کرنے کی قدرت سے کم وبیش عاری ہو۔ظاہر ہے کہ ایسی زبان میں بڑی شاعری نہیں ہوسکتی، بلکہ شاید شاعری ہی نہیں ہوسکتی''[۴۲]لیکن اس کے باوجود وہ اس بات پر مُصر ہیں کہ میر نے اپنی شاعری میں روزمرہ کا استعمال کر کے ایک عظیم کارنامہ انجام دیا ہے۔لکھتے ہیں کہ میر کی بڑائی اس میں ہے کہ انھوں نے روزمرہ کو شاعری کی زبان میں بدل دیا۔یہاں اس بات کی بھی وضاحت ضروری ہے کہ اگرچہ روزمرہ میں شخص،ماحول اورعہد کے اعتبار سے تبدیلی ہوتی رہتی ہے،لیکن اس کی بنیادی ہیئت ہرزمانے میں ہوتی ہے،چاہے وہ مثالی اور خیالی ہی ہو''[۴۳]

مضمون مذکور کے آخر میں خود ہی اس رائے کا اظہار کرتے ہیں کہ غالب کا مسئلہ یہ تھا کہ وہ ایسی زبان بنانا چاہتے تھے جو شاعری کی زبان ہو،یعنی جس میں علمی اورادبی دونوں طرح کی زبانوں کی ساری قوتیں ہوں ،اورکم زوریاں کوئی نہ ہوں،یا کم سے کم ہوں۔غالب اپنی کوشش میں بڑی حد تک کام یاب ہوئے اوران کی زبان آئندہ کے تمام شعرا کے لیے ایسا آئیڈل بن گئی جس کو حاصل کرنے کی سعی ہی ان شعرا کی زندگی کا ماحصل ٹھہری۔۔۔غالب جوزبان خلق کر گئے وہی اردو شاعری کی زبان رہی اورآج تک ہے''[۴۴]بعنیہ ایسی بات اخترانصاری نے بھی کہی ہے کہ اگر صرف مشہور ترین اسالیب سے اعتنا کیا جائے توذوقؔ، مومنؔ،مصحفیؔ،ناسخؔ اورآتشؔ میں سے ہرایک کے نام اور کام کے ساتھ جواسلوب وابستہ ہے وہ لائق ذکر اور مستحق مطالعہ قرار پائے گا کہ یہ وہ اسلوب ہیں جو نسلاً بعدنسلاً اردو کی غزلیہ شاعری پر سایہ فگن رہے اورجن کے زیرسایہ غزل اورغزل سرائی کے مستقل دبستانوں نے پرورش پائی۔اور پھران سب کے آخر میں مقطع غزل کے طور پر یا کسی داستان کے نقطۂ عروج کی طرح اس عظیم اسلوب کا ذکرآئے گا جس کو ہم اسلوبِ غالب کے نام سے جانتے اور پہچانتے ہیں۔اور جوشعری اسالیب کی دنیا میں میں بھی ایک منارۂ نور ہے،بلندوبعید بھی اورضوریزوضیاافروز بھی!

غالبؔ کے بعد اُردوغزل کی پوری ایک صدی-انیسویں صدی کے وسط سے بیسویں صدی کے وسط کا زمانہ -اسالیب کے زاویۂ نگاہ سے تہلکہ وخلفشار کا زمانہ ہے۔جس میں انتزاع واختلال کے پہلو بہ پہلو ایجادواختراع کا عمل بھی پوری شدت کے ساتھ جاری رہا۔اسالیب کی شکست وریخت،تخریب وانہدام،ترمیم وتنسیخ اور طلوع ونمود کے اس پورے دور کو اگرہم صحیح تناظر میں دیکھنا چاہیں تو شاید غالبؔ اوراس کے اسلوب ہی کے زاویے سے دیکھنا ہوگا،مطلب یہ کہ غالبؔ کے بعد غزل اوراسالیبِ غزل کی دنیا جس انتشار وبحران کا شکار رہی ہے اس کو غالبؔ اوراس کی ظالمانہ عظمت سے پیدا ہونے امتناعی اثرات کی روشنی میں ہی بہترین طور پرسمجھا جا سکتا ہے''۔[۴۵]

آخر میں لکھتے ہیں کہ غالب کے زمانے میں اردو نثر بھی فروغ پا چکی تھی اس لیے اس کے پاس زبان اور الفاظ کے امکانات وسیع تھے جبکہ میر کا دوران امکانات سے محروم تھا۔پھر میر کوسودا،حاتم اوردرد کا رنگ بھی منظور نہ تھا اس لیے انہوں نے اپنی شاعری کی بنیاد روزمرہ پر رکھی۔''اس وجہ سے میر کا لسانی کارنامہ غالب کے کارنامے سے کم ترنہیں۔بلکہ کچھ برتر ہی معلوم ہوتا ہے''۔[۴۶]

اب اگر فاروقی صاحب کے مذکورہ جواز کو درست تسلیم کیا جائے تو یہ سوال جنم لیتا ہے کہ جب ان دونوں شعرا میں زمانی بعد پایا جاتا ہے تو پھران کا آپس میں تقابل اورموازنہ چہ معنی دارد؟

فاروقی صاحب اپنے مضمون''خدائے سخن،میر یاغالب'' میں لکھتے ہیں کہ غالب اور میر کے بارے میں یہ مفروضہ بھی مہمل ہے کہ میر کے کلام میں اچھے شعر خال خال ہی ہیں اوراگرانہوں نے غالب کی طرح اپنے کلام کا انتخاب کیا ہوتا تو ان کے حق میں اچھا ہوتا۔میر کے یہاں بہترنہیں تودوتین ہی سونشتر ہوں گے،یہ خیال اس لیے عام ہے کہ لوگوں نے میر کا مطالعہ بغوراور بالاستیعاب نہیں کیا۔فراق صاحب نے بڑی فیاضی سے کام لیتے ہوئے میر کے یہاں''قدراول'' کے اشعار کی تعداد غالباً ڈھائی تین سو یا اس سے کچھ کم یا زیادہ بتائی ہے۔(اس حساب کی بھی داد دینا چاہیے)مجھ سے ایک مرحوم بزرگ نقاد نے بیان کیا کہ میر کے یہاں کئی

صفحے الٹنے پر ایک شعر ملتا ہے۔میر کی ضخامت سے زیادہ ہماری کم کوشی نے اس طرح کے خیالات کو عام کیا ہے۔اوران خیالات کواستحکام اس مفروضے نے بخشا ہے کہ غالب کا دیوان اس لیے مختصر ہے کہ انھوں نے اپنے کلام کا بہت سخت انتخاب کیا تھا۔میر بھی ایسا ہی کرتے تو اچھا ہوتا''[۴۷] پہلی بات تو یہ کہ لوگوں نے میر کا مطالعہ بغور اور بالاستیعاب کیوں نہیں کیا؟اس میں یا تو میر قصوروار ٹھہرتے ہیں یا لوگ لیکن بے چارے غالب کا کوئی قصور نہیں۔بظاہر اس کی ایک وجہ یہ بھی نظر آتی ہے کہ میر کے ہاں کوہ کندن وکاہ برآوردن والا معاملہ بھی ہوسکتا ہے۔میر کا کلیات خاصا ضخیم ہے اور اس سے دُر نایاب کا آسانی سے حصول کارِدارد ہے۔دوسرے یہ کہ میر کے ہاں معیار سے زیادہ مقدار کا چلن ہے اس لیے اس رطب ویابس سے گہرِ مقصود کا ہاتھ لگنا آسان نہیں۔اسی لیے مرحوم بزرگ نقاد نے جو کہا وہ درست کہا۔

اس امر کا اظہار خود فاروقی صاحب نے''شعرشورانگیز'' جلداول کے دیباچے میں کیا ہے کہ اصول یہ رکھا کہ غزل کی صورت برقرار رکھنے کے لیے مطلع ملا کر کم سے کم تین شعروں کا التزام رکھوں۔جہاں صرف دوشعر انتخاب کے لائق نکلے،وہاں تیسرا شعر(عام اس سے کہ وہ مطلع ہو یاسادہ شعر) بھرتی کا شامل کرلیا اورشرح میں صراحت کردی کہ کون سا شعر بھرتی کا ہے۔جہاں ایک ہی شعر نکلا،وہاں ایک پر اکتفا کی۔اس لیے کوشش کے باوجود اس انتخاب میں مفردات کی تعداد خاصی ہے''[۴۸] لیکن دوسری طرف یہ بھی فرماتے ہیں کہ اگر پورا کلیات،بغور پڑھا جاتا تو حقیقت کھل جاتی کہ میر کے یہاں اگرچہ ہرشعر رتبۂ اعلیٰ کو نہیں پہنچا ہوا ہے،لیکن کلام کا اوسط معیار پھر بھی اس قدر بلند ہے کہ خود کلیات ہی انتخاب کا حکم رکھتا ہے۔اعلیٰ درجے کے اشعار چار ہزار سے یقیناً کم نہیں ہیں،اورکلیات کے کم سے کم اسی فی صدی اشعار اچھے شعر کہے جانے کے مستحق ہیں۔زیرنظرانتخاب کی ضخامت کم رکھنے کے لیے مجھے کتنے پاپڑ بیلنے پڑے ہیں،وہ میں ہی جانتا ہوں''[۴۹] مذکورہ بالا دونوں اقتباسات میں واضح تضاداورتناقص پایا جاتا ہے۔

خود شاعر کا اپنے اشعار کا انتخاب کرنا نہایت مشکل کام ہے۔اس عمل میں آپ اپنا تماشائی بننا پڑتا ہے اور اپنے آپ کو اپنا غیر سمجھنا پڑتا ہے۔کسی بھی شاعر کے لیے اپنے کلام کے کچھ حصے کو حذف کرنا ایسے ہی ہے جیسے اپنے جسم کے کسی حصے کو الگ کر دینا۔کیوں کہ شاعر کے لیے اس کے اشعار اولاد معنوی کا درجہ رکھتے ہیں اور اولاد جتنی بھی بری ہو اس کو آسانی سے گھر سے نہیں نکالا جا سکتا۔یہ انہی کا کام ہے جن کے حوصلے زیاد ہوتے ہیں۔غالب میں یہ ہمت مخالفین کے طعنوں اور بہترتنقیدی صلاحیتوں کی بنا پر پیدا ہوئی۔فاروقی صاحب کا یہ الزام کہ اگروہ شروع کا کلام چھانٹ نہ دیتے تو بھی ان کا کلیات میر کے دیوان اول سے زیادہ ضخیم نہ ہوتا۔لہٰذا غالب کے کلیات اردو کا اختصار اس بنا پر نہیں ہے کہ انہوں نے سخت انتخاب کر کے کمزور شعر نکال دیے تھے''[۵۰] حقیقت یہ ہے کہ غالب کی شاعری کا تین چوتھائی حصہ فارسی پر مشتمل ہے اور اپنی فارسی شاعری پر ہی انہیں فخر بھی ہے۔جب وہ کہتے ہیں ؎

فارسی ہیں تابہ بینی نقش ہائے رنگ رنگ
بگزراز مجموعۂ اردو کہ بیرنگ منست

گویہ الگ بات کہ اس شعر میں ذوقؔ سے معاصرانہ چشمک کا پہلو بھی نکلتا ہے۔ہرفن کا نابغہ خود نقاد ہوتا ہے۔ایک تخلیق دوسری تخلیق سے اس لیے بہتر ہوتی ہے کہ اس کے خالق کا تنقیدی شعور دوسرے سے بہتر ہوتا ہے۔شعرشورانگیز کی سبھی جلدوں میں فاروقی صاحب نے اپنی ساری توانائیاں صرف اس بات پر صرف کی ہیں کہ میر کی شاعری تمام دنیا کی شاعری سے اعلیٰ اورارفع ہے

اور دنیا کا کوئی شاعر میر کی طرح ہمہ گیر شخصیت کا مالک نہیں۔ جیسا کہ میر نے خود بھی اپنی ایک مثنوی ''اژدرنامہ'' میں اپنی یکتائی کے حوالے سے کہا ہے کہ وہ ایک اژدہا ہے اور دیگر شعرا اس کے سامنے حشرات الارض کی سی حیثیت رکھتے ہیں ؎

یہ موذی کئی نا خبردار فن
نئی ناگنیں جن کے ٹیکوں پہ پھن
نہیں جانتے ہوں میں مارِسیاہ
زمانہ ہے آتش کا میری نگاہ

اس بارے میں جاوید رحمانی لکھتے ہیں کہ ''فاروقی نے میر کی ہمہ گیری کا جو تصور پیش کیا ہے اور میر کے دائرہ اظہار کو جس طرح پھیلایا ہے اس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ پھر کسی شاعر کو پڑھنے کی ضرورت کیا ہے؟ میر کا کلام کافی ہے''۔[۵۱]

اس ضمن میں انہوں نے میر کا تقابل دنیا کی سبھی معروف زبانوں اور ان کے معروف شعرا سے کیا ہے جن میں عربی، فارسی، اردو، ہندی، انگریزی، فرانسیسی، یونانی اور برصغیر کی دیگر علاقائی زبانیں بھی شامل ہیں۔ شعرشورانگیز'' پر بات کرتے ہوئے پروفیسر ابوالکلام قاسمی نے کہا ہے کہ شمس الرحمٰن فاروقی نے اپنے مبسوط تجزیے اور تعبیر میں کوشش کی ہے کہ یہ ایک ایسا عمدہ انتخاب بھی عمل میں آجائے جو کلام میر کے ہر رنگ اور ہر تیور کی عکاسی کر سکے۔ اس ضمن میں انہوں نے ان گنت مقامات پر دوسرے شاعروں کا میر سے موازنہ بھی کیا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ موازنے کے اس انداز سے صاف پتا چلتا ہے کہ وہ میر کی عظمت کو ہر قیمت پر مستحکم کرنا چاہتے ہیں، خواہ اس عمل میں بڑے اہم شاعروں کی انفرادیت کو اس طریق کار کی بھینٹ ہی کیوں نہ چڑھانی پڑے۔ وہ یوں تو یہ دعویٰ بھی کرتے ہیں کہ میں میر کو اس کے مسوں اور مہاسوں کے ساتھ پیش کرنا چاہتا ہوں مگر جب وہ میر کے شعر کو عملی تنقید کی کسوٹی پر کستے ہیں تو ان کو میر کے اوسط یا کم درجے کے شعر بھی کسی نہ کسی پہلو کے باعث درجۂ اول کے شعر ہی نظر آتے ہیں''[۵۲]

اب آخر میں اس حوالے سے ''شعرشورانگیز'' چند مثالیں پیش کی جاتیں ہیں۔ غزل نمبر ۹۲ کا پہلا شعر ؎

آنسو توڈر سے پی گئے لیکن وہ قطرہ آب
اک آگ تن بدن میں ہمارے لگا گیا

''غالب کا شعر یقیناً میر سے مستعار ہے ؎

دل میں پھر گریہ نے اک شور اٹھایا غالب
آہ جو قطرہ نہ نکلا تھا سو طوفاں نکلا

لیکن غالب کے یہاں مراعات النظیر، اور دوسرے مصرعے میں ''نکلا'' کا ابہام بہت خوب ہے۔ اس کے علاوہ، غالب نے براہ راست آنسو پینے کا ذکر نہیں کیا ہے، بلکہ پورے واقعے کی طرف اتنا بلیغ اشارہ کیا ہے کہ داستان خود بخود سمجھ میں آجاتی ہے۔ میر کے یہاں ایک خوبی غالب کی طرح ہے کہ انہوں نے قطرۂ آب کو براہ راست فاعل قرار دیا ہے۔ غالب کے شعر میں وہ قطرہ طوفان بن جاتا ہے، یعنی اپنا عمل خود ہی کرتا ہے۔ استعجاب اور رنج دونوں کے یہاں بہت خوب ہے۔ غالب نے ''پھر'' کا لفظ رکھ کر ایک مسلسل

عمل کی طرف اشارہ کیا ہے۔میر کا شعراس خوبی سے خالی ہے۔اس کے برخلاف،ڈر کی وجہ سے آنسوؤں کو پی جانااورخودڈر کی وجہ مخفی رکھنا میر کے شعر کی وہ خوبی ہے جو غالب کے یہاں نہیں''۵۳

غزل نمبر۱۱۶ کا شعر ؎

لڑکے جہان آباد کے یک شہرکرتے ناز
آجاتے ہیں بغل میں اشارہ جہاں کیا

''یک شہر'' کا محاورہ غالب کے اس شعر کی وجہ سے بہت مشہور ہوا ہے ؎

اب میں ہوں اورماتم یک شہرآرزو
توڑا جوتو نے آئینہ تمثال دار تھا

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ غالب کا شعرلاجواب ہے۔لیکن''جہان آباد''(جوایک شہرہے)کے اعتبار سے''یک شہر''میں جولطف ہے،وہ غالب کے یہاں نہیں،کیوں کہ غالب کے شعرمیں شہربستی یاکسی آبادی کا تلازمہ نہیں ہے اور''یک شہر''مجرداستعمال ہوا ہے''۔۵۴

غزل نمبر۱۴۳ کا شعر ؎

چتون بے ڈھب آنکھیں پھری ہیں پلکوں سے بھی نظرچھوٹی
عشق ابھی کیا جانئے ہم کو کیا کیا میردکھاوے گا

''پلکوں سے بھی نظرچھوٹی''کا مضمون غالب نے براہ راست اٹھالیا ہے ؎

وہ نگائیں کیوں ہوئی جاتی ہیں یارب دل کے پار
جو مری کوتاہی قسمت سے مژگاں ہوگئیں

بہت سے لوگوں کوغالب کے اس شعر کا مفہوم سمجھنے میں مشکل ہوتی ہے۔میر کا شعراگرسامنے ہوتا تو یہ بات نہ ہوتی۔غالب نے حسب معمول مضمون کو نیا رنگ دے دیا ہے اوراس میں اپنی مخصوص ڈرامائیت اورپیچیدہ وسعت پیدا کردی ہے،لیکن اولیت کا شرف میر کو ہے''۔۵۵

فاروقی صاحب نے تنقیدِ میر میں زیادہ تقابل غالب ہی سے کیا ہے اور ہرجگہ کوئی ایسا نکتہ سامنے لائے ہیں جس سے غالب کی نسبت میر کی برتری نظرآئے۔حالانکہ''تفہیمِ غالب''کے سلسلے میں ان کا اندازِتنقیدیکسر مختلف ہے۔اس میں وہ جان کاہی اور مُوشگافیاں نظرنہیں آتیں جو''شعرشورانگیز''کے صفحے صفحے پرنظرآتی ہیں۔جس طرح ڈاکٹرعبدالرحمٰن بجنوری نے''محاسنِ کلامِ غالب''میں نعرۂ مستانہ بلند کیا اورغالب کا موازنہ دنیا کے ہربڑے شاعر سے کیا تھا بالکل وہی اندازشمس الرحمٰن فاروقی نے بھی''شعرشورانگیز''میں اس فرق کے ساتھ اپنایا ہے کہ بجنوری کے یہاں جس قدرشدیداختصار پایا جاتا ہے،فاروقی صاحب کے ہاں اتنا ہی انتشاراور پھیلاؤ پایا جاتا ہے جوبعض اوقات ناگواری کااحساس بھی پیدا کرتا ہے۔

حواشی

۱۔ شمس الرحمٰن فاروقی، شعر شور انگیز (جلد اول، تیسرا ایڈیشن مع ترمیم واضافہ) قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، ۲۰۰۶ء ص ۲۳

۲۔ شمس الرحمٰن فاروقی، شعر، غیر شعر اور نثر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، اشاعت سوم، تصحیح شدہ ایڈیشن، ۲۰۰۵ء ص ۲۰، ۲۱

۳۔ شمس الرحمٰن فاروقی، ''میر کی شعری روایت''، مشمولہ، بُنیاد، لمز، لاہور، پاکستان، جلد دوم، شمارہ ۲، ۲۰۱۲ء ص ۹

۴۔ ایضاً، ص ۱۰

۵۔ ایضاً، ص ۱۰

۶۔ شمس الرحمٰن فاروقی، ''خدائے سخن، میر کہ غالب''؟ مشمولہ، شعر شور انگیز، محولہ بالا ۱، ص ۲۹

۷۔ ڈاکٹر وزیر آغا، غالب کا ذوق تماشہ، اقبال اکیڈمی پاکستان، لاہور، ۱۹۹۷ء ص ۸۲

۸۔ شمس الرحمٰن فاروقی، ''میر کی شعری روایت''، مشمولہ، بنیاد، لمز، محولہ بالا ۳، ص ۱۲

۹۔ ایضاً، ص ۱۳

۱۰۔ شمس الرحمٰن فاروقی، شعر شور انگیز، محولہ بالا ۱، ص ۲۵۰

۱۱۔ ایضاً، ص ۲۵۳

۱۲۔ ایضاً، ص ۲۶۴

۱۳۔ ایضاً، ص ۲۷۴

۱۴۔ ایضاً، ص ۲۷۶

۱۵۔ ایضاً، ص ۳۱۳

۱۶۔ شمس الرحمٰن فاروقی، ''میر کی شعری روایت''، مشمولہ، بنیاد، لمز، محولہ بالا ۳، ص ۱۵

۱۷۔ شمس الرحمٰن فاروقی، ''غالب کی میری''، مشمولہ، شعر شور انگیز، محولہ بالا ۱، ص ۴۹

۱۸۔ شمیم حنفی، ''غالب کی تخلیقی حسیت''، غالب انسی ٹیوٹ، نئی دہلی، ۲۰۰۵ء ص ۵۹

۱۹۔ ایضاً، ص ۲۳۰

۲۰۔ ایضاً، ص ۵۶

۲۱۔ شمس الرحمٰن فاروقی، ''میر کی شعری روایت''، مشمولہ، بنیاد، لمز، محولہ بالا ۳، ص ۱۷

۲۲۔ شمس الرحمٰن فاروقی، ''غالب اور جدید ذہن''، مشمولہ، شعر، غیر شعر اور نثر، محولہ بالا ۲، ص ۳۷۴

۲۳۔ اختر انصاری۔ غزل اور غزل کی تعلیم، تیسری اشاعت، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی، ۲۰۱۰ء ص ۸۴، ۸۵

۲۴۔ شمس الرحمٰن فاروقی، شعر شور انگیز، محولہ بالا ۱، ص ۱۰۱

۲۵۔ شمس الرحمٰن فاروقی، ''میر کی شعری روایت''، مشمولہ، بنیاد، لمز، محولہ بالا ۳، ص ۱۶

۲۶۔ ایضاً، ص ۱۶

۲۷۔ ایضاً، ص ۱۸

۲۸۔ ایضاً،ص۱۷

۲۹۔ شمس الرحمٰن فاروقی،شعرشورانگیز،محولہ بالا۱،ص۳۶

۳۰۔ ایضاً،ص۳۵

۳۱۔ شمس الرحمٰن فاروقی،اردوشاعری پرغالب کااثر،مشمولہ،شعر،غیرشعراورنثر،محولہ بالا۲،ص۳۶۵

۳۲۔ جاویدرحمانی،غالب تنقید،انجمن ترقی اردو(ہند)نئی دہلی،۲۰۰۶ء،ص۱۸۰

۳۳۔ شمس الرحمٰن فاروقی،شعرشورانگیز،محولہ بالا۱،ص۴۲

۳۴۔ شمیم حنفی،غالب کی تخلیقی حسیت،محولہ بالا۱۸،ص۱۱۷

۳۵۔ شمس الرحمٰن فاروقی،شعر،غیرشعراورنثر،محولہ بالا۲،ص۳۷۶

۳۶۔ شمس الرحمٰن فاروقی،شعرشورانگیز،محولہ بالا۱،ص۶۹

۳۷۔ ایضاً،ص۲۷۶

۳۸۔ ایضاً،ص۳۰

۳۹۔ ایضاً،ص۴۳،۴۴

۴۰۔ ایضاً،ص۵۲

۴۱۔ ایضاً،ص۵۴،۵۵

۴۲۔ ایضاً،ص۵۶

۴۳۔ ایضاً،ص۵۶

۴۴۔ ایضاً،ص۵۷،۵۸

۴۵۔ اخترانصاری،غزل اورغزل کی تعلیم،محولہ بالا۲۳،ص۸۴

۴۶۔ شمس الرحمٰن فاروقی،شعرشورانگیز،محولہ بالا۱،ص۵۸

۴۷۔ ایضاً،ص۴۰

۴۸۔ ایضاً،ص۲۰

۴۹۔ ایضاً،ص۴۱

۵۰۔ ایضاً،ص۴۱

۵۱۔ جاویدرحمانی،غالب تنقید،محولہ بالا۳۲،ص۱۸۱

۵۲۔ پروفیسرابوالکلام قاسمی،''میرتنقیداورتنقیدی رویے''،مشمولہ،میرتقی میر:منتخب مضامین،مرتبین،ڈاکٹرتحسین فراقی،ڈاکٹرعزیزابن الحسن،مقتدرہ قومی زبان،پاکستان،۲۰۱۰ء،ص۳۸۷،۳۸۸

۵۳۔ شمس الرحمٰن فاروقی،شعرشورانگیز،محولہ بالا۱،ص۳۷۸،۳۷۹

۵۴۔ ایضاً،ص۵۳۴

۵۵۔ ایضاً،ص۶۰۹